نظموں میں جو تجربہ بیان ہوا ہے وہ انتہائی ذاتی اور خود شاعر کی روح میں پیوست ہے ان نظموں کے متکلم کو افسانے کا واحد متکلم نہیں کہا جا سکتا۔ ن م راشد کے ہاں ایسی نظموں کی کمی نہیں جو انتہائی ذاتی نظمیں ہیں۔ انھیں محض خودنوشت کے انداز کی نظمیں کہہ کر ٹالنا ممکن نہیں ہے۔ خودنوشت میں تو انسان اپنے پڑھنے والے، یا ماحول، یا مصلحت کا خیال کر کے کچھ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ یہ نظمیں سراسر سچے دل سے محسوس کی گئی اور بیان کی گئی نظمیں ہیں۔

راشد کی سامراج دشمنی

پروفیسر فتح محمد ملک

In this article, Professor Fateh Mohammad Malik informs the reader about Rashed's political vision and his analytical understanding of political events as an essential theme in his poetry. Rashed's involvement, concern and denunciation of hegemonic forces in the Asian region is highlighted.

رواں صدی کی تیسری دہائی میں ہمارے ادبی افق پر شاعروں کی جو نئی نسل نمودار ہوئی تھی اُس میں ن م راشد کی شاعری سب سے زیادہ زوردار رزمیہ آہنگ رکھتی ہے۔ وہ اقبالؔ کے بعد ممتاز و منفرد مقام حاصل کرنے والے شاعروں میں سب سے بڑے سامراج دشمن دانشور ہیں۔ فکر و فن کی تدریجی نشو و نما کے پہلے دور میں اگر اُن کے ہاں سامراج دشمن لَے بلند آہنگ ہے تو آخری دور میں زیرِ لب، مگر از اوّل تا آخر اُن کی شاعری سامراجی اور نو آبادیاتی یلغار کے خلاف شمشیر برہنہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو تنقید نے اکثر و بیشتر، راشد کی شاعری میں جنس اور جسمانیت کی تحسین و تردید ہی سے سروکار رکھا ہے۔ اس ضمن میں فرائیڈین سکول تو خیر اپنی اُفتادِ طبع سے مجبور تھا مگر ادب کو انقلاب کا نقیب گرداننے کے خوگر مارکسی نقاد بھی راشد کی شاعری پر فحش نگاری اور فراریت پسندی کی تہمتیں دھرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ راشد ہر نوع کے سامراج کے جانی دشمن ہیں۔ وہ مغربی سامراج کے ساتھ ساتھ سوویٹ سامراج اور اُبھرتے ہوئے برہمن سامراج سے بھی شدید نفرت کرتے ہیں۔ راولپنڈی سازش

کیس میں ملوث ہو کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والے ''انقلابیوں'' کے ساتھ تمام تر ہم دردی کے باوجود وہ بڑی دل سوزی کے ساتھ اپنے اشتراکی دوست کو سوویٹ استعمار کی غارت گری سے یوں خبردار کرتے ہیں:

.....مگر تو نے دیکھا بھی تھا

دیوتا تار کا حجرۂ تار

جس کی طرف تو اُسے کر رہا تھا اشارے

جہاں بام و دیوار میں کوئی روزن نہیں ہے

جہاں چار سُو باد و طوفاں کے مارے ہوئے راہگیروں

کے بے انتہا استخواں ایسے بکھرے پڑے ہیں

ابد تک نہ آنکھوں میں آنسو، نہ لب پہ فغاں!

(انقلابی)

یہ بات معنی خیز ہے کہ راشد کے ہاں اشتراکی روس کا تصور ہمیشہ ایک ایسے تاریک زنداں کی صورت میں اُبھرتا ہے جس میں وسطِ ایشیا کے مسلمان محبوس ہیں۔ راشد صاحب کو ایران میں اپنے قیام کے دوران ایشیا میں مغربی سامراج کے ساتھ ساتھ روسی سامراج کے پھیلتے ہوئے اثرات کا جیتا جاگتا مشاہدہ کرنے اور مغرب اور روس ہر دو کے باہم متصادم سامراجی عزائم کا سچا ادراک حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ۱۹۴۳ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک برٹش انڈین آرمی کے انٹر سروسز پبلک ریلیشنز آفیسر کی حیثیت میں کام کرتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں برطانوی اور روسی سامراجی قوتوں کی باہمی آویزش زوروں پر تھی۔ پروفیسر برائن سپونر نے سیمیں دانشور کے ایک ناول پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اُس زمانے کے ایران کا ذکر درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"From 1941 to 1945 Iran was reduced to the most abject state of dependence of its modern history, while still nominally

retaining its own independent government under the young Shah. The occupying powers subordinated everything to the economic and political objectives of supplying the eastern front and winning the war, with disastrous results for Iran's small economy. The worst of the results was widespread famine, especially in 1942-1943, triggered by a poor harvest the previous year. Corruption, incompetence and arrogance characterized almost anyone in authority, in national and local government, the army and the police. The influence of the occupying powers had a Christian-religious extension in the south, and a communist- ideological extension in the north, both of which were socially disruptive."(1)

یہ تھی وہ سنگین صورتِ حال جس میں ن م راشد برطانوی قابض فوج کے ایک محکوم افسر کے طور پر مقبوضہ ایران میں وارد ہوئے تھے۔ چنانچہ اُن کے سلسلۂ منظومات بعنوان ''ایران میں اجنبی'' کا آغاز برطانوی سامراج کے ایک کارندے کی حیثیت میں ایران میں اپنی موجودگی پر معذرت سے ہوتا ہے:

''ہم اس کے مجرم نہیں ہیں، جانِ عجم نہیں ہیں

وہ پہلا انگریز

جس نے ہندوستاں کے ساحل پہ

لا کے رکھی تھی جنسِ سوداگری

یہ اس کا گناہ ہے

جو ترے وطن کی

زمینِ گل پوش کو

ہم اپنے سیاہ قدموں سے روندتے ہیں!

اپنی بندگی و بے چارگی کے اِس اعتراف کے پیرائے میں راشد اپنی مخاطب کو دردِ

مشترک سے پیدا ہونے والی اِس کربناک صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہیں اور ہر دو قوموں پر مسلط سامراجی قوتوں سے نجات ایک سامراج دشمن ایشیائی اتحاد میں دیکھتے ہیں۔ چنانچہ نظم سامراج کی ''آہنی کمندِ عظیم'' کو عنکبوت کے جال کی مانند توڑ کر رکھ دینے کی تمنا پر آ تمام ہوتی ہے:

بس ایک زنجیر،
ایک ہی آہنی کمندِ عظیم
پھیلی ہوئی ہے،
مشرق کے اِک کنارے سے دوسرے تک،
مرے وطن سے ترے وطن تک،
بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں!

تڑپ رہے ہیں
بس ایک ہی دردِ لادوا میں،
اور اپنے آلامِ جاں گزا کے
اس اشتراک گراں بہا نے بھی
ہم کو اِک دوسرے سے اب تک
قریب ہونے نہیں دیا ہے!''

(من وسلویٰ)

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایران میں اپنے قیام کے دوران راشد اپنی ذاتی اور اپنی قومی و ملّی زندگی پر سامراج کی غلامی کے اثرات پر ہر آن بڑی دل سوزی کے ساتھ تخلیقی غور و فکر میں

مصروف رہے ہوں۔ وہ اپنے فرائضِ منصبی کی ادائگی میں مصروف ہوں یا سیر و تماشا میں مشغول، محکوم ایشیا کے مصائب اُن کے دل و دماغ کو ہر آن اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ اِس کی ایک مثال اُن کی نظم 'تماشا گہِ لالہ زار' ہے۔ بظاہر وہ تہران کے لالہ زار سینما میں تھیٹر دیکھ رہے ہیں مگر اُن کا دِل کچھ اور طرح کے سوالات میں منہمک ہے:

تماشا گہِ لالہ زار،

''تیاتر'' پہ میری نگاہیں جمی تھیں
مرے کان ''موزیک'' کے زیر و بم پر لگے تھے،
مگر میرا دل، پھر بھی کرتا رہا تھا
عرب اور عجم کے غموں کا شمار
تماشا گہِ لالہ زار!

نظم ایران کے ماضی کی شان و شوکت کے لُٹ کر رہ جانے اور اپنی قدیم تہذیب کے زوال کی نوحہ خوانی پر غور و فکر کرتے ہوئے نئے آدمی کے خواب پر ختم ہوتی ہے:

تماشا گہِ لالہ زار،

عروسِ جواں سالِ فردا، حجابوں میں مستور
گر سنہ نگہ، زود کاروں سے رنجور
مگر اب ہمارے نئے خواب کابوسِ ماضی نہیں ہیں،
ہمارے نئے خواب ہیں، آدمِ نو کے خواب
جہانِ تگ و دو کے خواب!
جہانِ تگ و دو، مدائن نہیں،
کاخِ فغفور و کسریٰ نہیں
یہ اُس آدمِ نو کا ماویٰ نہیں

نئی بستیاں اور نئے شہر یار

تماشا گہِ لالہ زار!

(تماشا گہِ لالہ زار!)

راشد کی متعدد نظموں کی طرح یہ نظم بھی اقبال کی شاعری کو آواز دیتی سنائی دیتی ہے۔ نظم کا آخری بند پڑھتے وقت اقبال کا درج ذیل شعر دل و دماغ میں گونجنے لگتا ہے:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

جہاں تک سامراجی حکمتِ عملی کے عیاں اور پنہاں ہتھکنڈوں کو بے نقاب کرنے کا تعلق ہے، اِسی سلسلۂ منظومات کی نظم 'تیل کے سوداگر' ہماری جدید اور ترقی پسند شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ اِس طویل نظم کا پہلا مصرع: ''بخارا سمرقند اک خالِ ہندو کے بدلے'' ہی حافظ سے لے کر اقبال تک ہماری تہذیبی اور شعری روایت کو ہمارے دل و دماغ میں زندہ کر دیتا ہے۔ اقبال نے بھی کچھ ایسی ہی حسرت کے ساتھ حافظ کے زبان زدِ عام شعر کے تناظر میں کہا تھا:

بدستِ مانہ سمرقند و نے بخارایی ست

دعا بگو ز فقیراں بہ تُرکِ شیرازی

اقبال کی طرح راشد کے ہاں بھی بخارا اور سمرقند فقط دو شہروں کے نام نہیں بلکہ ایک خاص قومی و ملّی طرزِ احساس کے استعارے ہیں۔ راشد صاحب نے یہ نظم آج سے ساٹھ برس پیشتر جنگ عظیم دوئم کے زمانے میں کہی تھی۔ جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے اس زمانے کا ایران مغربی اور روسی فوجوں کے قبضہ میں تھا۔ اس نظم کا پس منظر سامراجی تسلط کے ستم سہتی ہوئی ایرانی زندگی ہے۔ نظم کا فوری محرک ایران پر اشتراکی روس کے ساتھ تیل کی تلاش کے ایک معاہدے پر رضامند ہو جانے کے لئے سامراجی دباؤ ہے۔ راشد اہلِ ایران کو سامراجی حکمت عملی کے بھیانک نتائج کی جانب متوجہ کرتے وقت سنٹرل ایشیا پر اشتراکی تسلط کے احوال و مقامات کی جانب انتہائی خیال

انگیز طنزیہ اشارے کرتے ہیں۔ نظم بخارا اور سمرقند کی یاد سے شروع ہوتی ہے:

بخارا سمرقند اک خالِ ہندو کے بدلے!

بجا ہے، بخارا سمرقند باقی کہاں ہیں؟

بخارا سمرقند نیندوں میں مدہوش،

اک نیلگوں خامشی کے حجابوں میں مستور

اور رہروؤں کے لیے ان کے در بند،

سوئی ہوئی مہ جبینوں کی پلکوں کے مانند

روسی ''ہمہ اوست'' کے تازیانوں سے معذور

دو مہ جبینیں!

حافظ کے زبان زدِ عام شعر کے حوالے سے سمرقند و بخارا کو مسلمانوں کی تہذیبی بالادستی کی دو علامتوں کے طور پر استعمال کر کے شاعر نے مسلمانوں کی موجودہ تہذیبی غلامی کی جو تصویر پیش کی ہے، وہ تہذیبی زوال اور سیاسی استبداد کے المیہ کو اپنی تمام تر سفاکی کے ساتھ اُجاگر کرتی ہے۔ نظم کے دوسرے بند میں سمرقند و بخارا زوال اور استبداد کے تاریخی پس منظر میں عصری زندگی کے لئے درسِ عبرت بن جاتے ہیں:

بخارا سمرقند کو بھول جاؤ

اب اپنے درخشندہ شہروں کی

تہران و مشہد کے سقف و در و بام کی فکر کر لو،

تم اپنے نئے دورِ ہوش و عمل کے دل آویز چشموں کو

اپنی نئی آرزوؤں کے ان خوبصورت کنایوں کو

محفوظ کر لو!

ان اونچے درخشندہ شہروں کی

کوتہ فصیلوں کو مضبوط کر لو
ہر اک برج و بارو پہ اپنے نگہباں چڑھا دو،
گھروں میں ہوا کے سوا
سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن،
تیل کے بوڑھے سوداگروں کے لبادے پہن کر،
وہ کل رات یا آج کی رات کی تیرگی میں،
چلے آئیں گے بن کے مہماں
تمہارے گھروں میں
وہ دعوت کی شب جام و مینا لنڈھائیں گے
ناچیں گے، گائیں گے،
بے ساختہ قہقہوں، ہمہموں سے
وہ گرمائیں گے خونِ محفل
مگر پو پھٹے گی
تو پلکوں سے کھودو گے خود اپنے مردوں کی قبریں
بساطِ ضیافت کی خاکسترِ سوختہ کے کنارے
بہاؤ گے آنسو!

تیل کے سوداگروں کے بھیس میں دوستی کے لبادے پہن کر آنے والے مہمانوں کی سامراجی حکمتِ عملی اور طرزِ عمل کو شاعر نے گہری سیاسی بصیرت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ یہ مہمان اپنے میزبان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے اصل روحِ حیات کو کس طرح فنا کر دیتے ہیں؟

آزادی اور خود مختاری سلب کر کے اور ان کا قومی شیرازہ بکھیر کر کس طرح چپکے ہی چپکے ان کو چلتی پھرتی زندہ لاشوں میں بدل دیتے ہیں؟ رات کی ناچتی گاتی، پیتی پلاتی ضیافت کی بساط جب صبحدم الٹی جائے گی تب کھلے گا کہ وہ تو مر چکے ہیں۔ برطانوی سامراج کے چنگل میں تڑپتا ہوا شاعر اپنے ایرانی بھائیوں کو اپنے تجربات سے پھوٹتی ہوئی روشنی میں روسی سامراج کی خونخوار تمناؤں کو سمجھنے اور ان کی دستبرد سے بچ نکلنے کی راہ سجھاتا ہے:

بہائے ہیں ہم نے بھی آنسو،
ہماری نگاہوں نے دیکھے ہیں
سیال سایوں کے مانند گھلتے ہوئے شہر
گرتے ہوئے بام و در
اور مینار و گنبد
ہمارے برہنہ و کاہیدہ جسموں نے
وہ قید و بند اور وہ تازیانے سہے ہیں
کہ ان سے ہمارا ستمگر
خود اپنے الاؤ میں جلنے لگا ہے

راشد کے نزدیک اس مردہ، غلام زندگی سے نجات کا راستہ موجود ہے۔ زندگی کو جاتا ہوا یہ راستہ ایشیائی اتحادِ عمل کا راستہ ہے۔ اپنے تہذیبی اشتراک کی بنیاد پر اپنے مشترکہ ستم گروں کے خلاف مزاحمت کا راستہ۔ چنانچہ شاعر اپنے ایرانی بھائیوں کو اتحادِ فکر و عمل کے لئے پکارتا ہے:

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!
کہ دیکھی ہیں میں نے
ہمالہ والوند کی چوٹیوں پر، انا کی شعاعیں،

انھی سے وہ خورشید پھوٹے گا آخر
بخارا سمرقند بھی سالہا سال سے
جس کی حسرت کے دریوزہ گر ہیں۔

یہاں یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ہمالہ والوند کی چوٹیوں پر اُنا کی جن شعاعوں کی جانب راشد ہمیں متوجہ کر رہے ہیں وہ اقبال کی انقلابی فکر سے پھوٹی ہیں:

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

واقعتاً مشرق کی نجات مسلمان ممالک کے ربطِ باہم میں پوشیدہ ہے۔ اِس حقیقت کو سامراجی قوتوں نے بھی خوب سمجھا ہے۔ چنانچہ یہ سامراجی قوتیں مسلمانوں کے ربطِ باہم کو توڑنے اور یوں پورے مشرق کو اپنے ریموٹ کنٹرول میں رکھنے کی حکمتِ عملی پر عمل پیرا ہیں۔ ن م راشد نے اقبال کی نقالی کی بجائے اپنے عصری تناظر میں فکرِ اقبال سے تخلیقی اکتساب کا شیوہ اپنایا ہے۔

تاریخ نے دیکھا کہ راشد کا دکھایا ہوا راستہ بالآخر کامیابی کی کلید ثابت ہوا۔ سوویٹ روس کے اشتراکی سامراج کے خلاف عوامی جدوجہد کا راستہ ہی بخارا و سمرقند یعنی سنٹرل ایشیا کی آزادی کا صراطِ مستقیم ثابت ہوا۔ آج پورا ایشیا مغربی سامراج کے براہِ راست تسلط سے آزاد ہے مگر آج ایک بار پھر امریکی، یورپی اور روسی استعمار یک جان اور سہ قالب بن کر ایشیا کو پھر سے اسے اپنے نوآبادیاتی جال میں پھنسانے میں کوشاں ہیں۔ اقبال کے بعد راشد ہمارے وہ تنہا شاعر ہیں جنھوں نے برطانوی سامراج کی پسپائی کے آغاز ہی میں یہ راز پا لیا تھا کہ پسپا ہوتے ہوئے برطانوی سامراج نے برٹش انڈیا میں اپنے جانشیں سامراج کی ساخت پرداخت شروع کر دی ہے۔ اِس حقیقت کا پہلا بھرپور عکس راشد کی نظم 'سومنات' میں جلوہ گر ہے۔

اگر 'سومنات' کی سی عہد آفرین تخلیق آج تک ہم نقادوں کی توجہ سے محروم چلی آ رہی ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اس لئے کہ راشد نے برطانوی ہند میں آزادی کی تحریک کو

اپنے فکر و فن کے آئینے میں منعکس کرتے وقت اپنے زمانے کے سکہ بند اشتراکی اور سرمایہ دارانہ تصورات فن کو کاملاً رد کر دیا ہے۔ ہر چند وہ برصغیر میں بسنے والی تمام قوموں کی آزادی کے تمنائی ہیں مگر ان کی تخلیقی شخصیت کا بنیادی پیچ و تاب اُن کی اپنی مسلمان قوم اور اس کی ہم نصیب اچھوت قوم کے مصائب سے پھوٹ رہا ہے۔ راشد کی فکر حیرت انگیز پیش بینی کے ساتھ اپنے عہد کے مقبولِ عام انقلابی سیاسی نعروں میں اُلجھ کر رہ جانے کی بجائے اس حقیقت کی تہ تک پہنچ گئی ہے کہ پسپا ہوتا ہوا فرنگی سامراج ہندوستان میں ایک نئے برہمنی سامراج کو اپنا جانشین بنانے میں سرگرمِ عمل ہے۔ چنانچہ ''بردہ فروشِ افرنگ'' برہمنیت کے دیو استبداد کو آزادی کی نیلم پری بنا کر پیش کرنے میں کوشاں ہے۔ ''عجوزۂ سومنات'' اس نئے سامراج کا بڑا ابلیغ استعارہ ہے۔ نظم صدیوں پر پھیلی ہوئی ہندو مسلم کش مکش کو ڈرامائی انداز میں فوکس میں لاتی ہے۔ فرنگی اس کشمکش کو ایک نیا عصری روپ دینے میں مصروف ہے۔

میں جب بھی بھارت اور امریکہ کی فوجی یگانگت اور سیاسی یکجہتی کے باب میں کوئی نئی خبر پڑھتا ہوں تو مجھے بے ساختہ ن م راشد مرحوم کی پُرانی نظم 'سومنات' یاد آ جاتی ہے۔ ساٹھ برس پُرانی یہ نظم اُس زمانے کی یادگار ہے جب برصغیر میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ اس نظم میں پیش کیے گئے صداقت پسندانہ تجزیے کی رُو سے فرنگی سامراج جاتے جاتے متحدہ ہندوستانی قومیت کے نام پر ایک ایسے نئے سامراج کی داغ بیل ڈالنے میں کوشاں ہے جو برصغیر کی تمام قوموں کو اپنے جال میں اسیر کر کے برطانوی سامراج کی جانشینی کا حق ادا کر سکے۔ ایسے میں راشد کی امیدیں مسلمان قوم سے وابستہ ہیں اور وہ سوچ رہے ہیں کہ مسلمان اپنی جداگانہ قومی ہستی کے اثبات سے اس نئی سامراجی سازش کا پردہ چاک کر ڈالیں گے۔ ہندی مسلمان راشد کی توقعات پر پورا اُترے اور قیامِ پاکستان سے انھوں نے برصغیر کی دیگر اقوام کے سامنے آزادی و خودمختاری کی راہیں روشن کر دیں۔

راشد نے نظم 'سومنات' ہندوستان میں برپا سیاسی ہنگاموں سے دُور بیٹھ کر لکھی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ برٹش انڈین آرمی کے شعبۂ تعلقات عامہ میں کیپٹن راشد کی حیثیت میں

تہران، بصرہ، بغداد، قاہرہ اور کولمبو میں فرائضِ منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ عرب اور عجم کے غموں کا شمار کرنے میں مصروف تھے۔ ۱۹۴۳ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے اس وقفۂ زماں میں اگر ایک طرف راشد نے ہندوستان میں آزادی کی تحریک کا بے لاگ اور سفاک تجزیہ کیا ہے تو دوسری طرف وہ فرنگی استعمار کے عزائم کو بھی بے نقاب دیکھ پائے ہیں۔ دورانِ جنگ کی مسافرت اور کرائے کے سپاہی کی ذلت بھری زندگی کے تجربات نے اُن کے سیاسی شعور کو ایک نئی انقلابی دھار بخشی اور وہ مسلمانوں کی قومی جدوجہد کو مشرق کی نجات کا مرحلۂ اوّل سمجھنے لگے۔ جذباتی سیاسی نعروں میں اُلجھ کر رہ جانے کی بجائے راشد کی فکر اس حقیقت کی تہ تک پہنچ گئی ہے کہ پسپا ہوتا ہوا فرنگی سامراج ہندوستان میں ایک نئے برہمنی سامراج کو اپنا جانشین بنانے میں سرگرمِ کار ہے۔

نئے سرے سے غضب کی سج کر
عجوزۂ سومنات نکلی
مگر ستم پیشۂ غزنوی
اپنے حجلۂ خاک میں ہے خنداں!
اور اب فرنگی یہ کہہ رہا ہے:
کہ ''آؤ اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو
جس کے مالک تمھی ہو
ہم مل کے نورِ کمخواب سے سجائیں''

فرنگی یہ جاننے کے باوجود کہ ایسا کوئی جادو کہیں بھی دستیاب نہیں جو اس بڑھیا کے عیوب کو محاسن بنا کر پیش کر سکے، تماشائیوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے میں مصروف ہے۔ کاروانِ آزادی ایک جلوس کی صورت میں رواں دواں ہے اور:

عجوزۂ سومنات کے اس جلوس میں ہیں
عقیم صدیوں کا علم لادے ہوئے برہمن

جو اک نئے سامراج کے خواب دیکھتے ہیں
اور اپنی توندوں کے بل پہ چلتے ہوئے مہاجن
حصولِ دولت کی آرزو میں بہ جبرِ عریاں
جو سامری کے فسوں کی قاتل حشیش پی کر
ہیں رہگذاروں میں آج پا کوب و مست و غلطاں
دف و دہل کی صدائے دلدوز پر خروشاں!
کسی جزیرے کی کوروادی کے
وحشیوں سے بھی بڑھ کے وحشی
کہ اُن کے ہونٹوں سے خوں کی رالیں ٹپک رہی ہیں
اور اُن کے سینوں پہ کاسۂ سر لٹک رہے ہیں
جو بن کے تاریخ کی زبانیں
سنا رہے ہیں فسانۂ صد ہزار انساں!
اور اُن کے پیچھے لڑھکتے لنگڑاتے آ رہے ہیں
کچھ اشتراکی،
کچھ اُن کے احساں شناس مُلّا
بجھا چکے ہیں جو اپنے سینے کی شمعِ ایقاں!

یہ جلوس گویا برصغیر میں بسنے والی تمام قوموں کی آزادی کی بجائے ایک تازہ تر غلامی کی جانب پیش رفت سے عبارت ہے۔ ہر چند برہمنیت کی استحصالی روح نے فرنگی سامراج کے جدید قالب میں ڈھل کر خود کو پُرفریب اور خوش آہنگ نعروں میں چھپا رکھا ہے تاہم مسلمان، اچھوت اور دہقان سومنات کی بُڑھیا کے اس جلوس میں شامل ہونے سے انکاری ہیں اور اس نام نہاد کاروانِ آزادی کو اندیشہ ہائے دور دراز کے ساتھ دیکھ رہے ہیں:

مگر سرِ راہ تک رہے ہیں
کبھی تو دہشت زدہ نگاہوں سے
اور کبھی یاس جاں گزا سے
غریب و افسردہ دل مسلماں
جو سوچتے ہیں
کہ ''اے خدا
آج اپنے آبا کی سرزمین میں
ہم اجنبی ہیں،
ہدف ہیں نفرت کے ناوکِ تیز و جاں ستاں کے!''

مسلمانوں کو مٹا ڈالنے یا ہندوستان سے باہر دھکیل دینے کی علمبردار شُدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں سے لے کر پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی کے مسلمانوں کو مسلمانانِ ہند و مزاج بنا دینے کے منصوبوں تک کتنے ہی بھیانک حقائق درج بالا مصرعوں سے جھانک رہے ہیں؟ اپنے ہی وطن میں اجنبی ہو کر رہ جانے کا احساس اگر مسلمانوں کو دہشت زدہ کیے دے رہا ہے تو اچھوتوں کو ہزار ہا برس پر پھیلے ہوئے ماضی کے مصائب یاد دلا رہا ہے:

منو کے آئیں کا ظلم سہتے ہوئے ہریجن
کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لیے
ہے دُزدِ شبِ زمستاں
وہ سوچتے ہیں!
''کہیں یہ ممکن ہے
بیچ ڈالے گا
ہم کو بردہ فروشِ افرنگ

اب اُسی برہمن کے ہاتھوں
کہ جس کے صدیوں پُرانے سیسے سے
آج بھی کورو کر ہیں سب ہم
جواب بھی چاہے
تو روک لے ہم سے نورِ عرفاں!''

اچھوت (ہریجن، دلت) اس دہشت سے کانپ رہا ہے کہ آدم فروشی کے کاروبار میں مصروف فرنگی ہم کو پھر سے اُسی برہمن کے ہاتھ بیچ ڈالنے کا بھیانک کھیل کھیلنے میں مصروف ہے جس نے ہمارے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اُنڈیل کر ہمیں صدیوں سے اندھا اور بہرا کر رکھا ہے اور ہم پر علم و عرفان کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ اِس جلوس کے مسلمان اور اچھوت تماشائیوں کے ساتھ مظلوم کسان بھی کھڑے اس تماشے کو بچوں کی سی حیرت کے ساتھ دیکھ رہے ہیں:

ستم رسیدہ نحیف دہقاں
بھی اس تماشے کو تک رہا ہے
اُسے خبر بھی نہیں کہ آقا بدل رہے ہیں
وہ اس تماشے کو
طفلِ کمسن کی حیرتِ تابناک سے محض دیکھتا ہے!
جلوس وحشی کی آز سے
سب کو اپنی جانب بلا رہا ہے
کہ ربّہ سومنات کی بارگاہ میں آ کے سر جھکاؤ!
مگر وہ حسِ ازل
جو حیواں کو بھی میسر ہے
سب تماشائیوں سے کہتی ہے

''اس سے آگے اجل ہے
بس مرگِ لم یزل ہے!''
اسی لئے وہ کنارِ جادہ پر ایستادہ ہیں، دیکھتے ہیں!

نظم اس امید پر ختم ہوتی ہے کہ تماشائی ہمیشہ یونہی خاموش تماشائی ہی نہ بنے رہیں گے بلکہ اس نئی سامراجی سازش کا پردہ چاک کردیں گے:

نہیں، وہ ساعت قریب ہے
جب وہ ربّہ سومنات کے اس طلسمِ نازک کو
غزنوی بن کے نوچ ڈالیں گے
چاک کردیں گے
وہم و بیداد و زر پرستی کی سازشِ تازہ تر کا داماں!

(سومنات)

راشد کے اس صداقت پسندانہ تجزیے کی رُو سے فرنگی سامراج جاتے جاتے متحدہ ہندوستانی قومیت کے نام پر ایک ایسے نئے سامراج کی داغ بیل ڈالنے میں کوشاں تھا جو برصغیر کی تمام قوموں کو اپنی زنجیر میں اسیر کر سکے۔ ایسے میں راشد کی امیدیں مسلمان قوم سے وابستہ تھیں اور وہ سوچ رہے تھے کہ مسلمان اپنی جداگانہ قومی ہستی کے اثبات سے اس نئی سامراجی سازش کا پردہ چاک کر ڈالیں گے۔ ہندی مسلمان راشد کی توقعات پر پورا اُترے اور قیامِ پاکستان سے انھوں نے برصغیر کی دیگر اقوام کے سامنے آزادی و خودمختاری کی راہیں روشن کردیں۔

ایک ایسے زمانے میں جب جدیدیت کے دبستانِ ادب میں فن برائے فن کے نام پر ادب و فن کو مقصدیت کی ''آلائش'' سے پاک کر کے رکھ دینا سب سے بڑا کارنامۂ فن اور ترقی پسند ادبی تحریک کے وابستگان کے نزدیک سوویٹ روس استعمار دشمن عوامیت کی سب سے بڑی مثال قرار پایا تھا، ن م راشد نے ہر دو دبستانوں کی ادبی سیاست سے انحراف کی راہ اپنائی۔ ہر چند

دونوں ادبی دبستانوں نے راشد کی شاعری کی تحسین میں بڑی فراخدلی سے کام لیا۔ میراجی نے راشد کے دورِ اوّل کی متعدد نظموں پر تحسینی مضامین لکھے اور فیض نے راشد کے پہلے مجموعۂ کلام ''ماورا'' کے دیباچے میں بڑی گرمجوشی کے ساتھ بزمِ ادب میں راشد کے طلوع کا خیر مقدم کیا مگر اس کے باوجود راشد کی انفرادیت نے اِن دو میں سے کسی بھی غالب دبستانِ ادب کی چاکری گوارا نہ کی۔ تہذیب، معاشرت اور ادب و فن پر سیاست کے اثرات اُن کی شاعری کا مرکزی موضوع بنے رہے۔ اِس باب میں بھی وہ اپنے ترقی پسند ساتھیوں کی طرح صرف مغربی سامراج تک محدود نہ رہے بلکہ انھوں نے اس کے ساتھ ساتھ سوویٹ سامراج اور برہمن سامراج کو بھی اپنی انسان دوست اور سامراج دشمن شاعری کا موضوع بنایا۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو راشد اپنے دور کے سب سے بڑے سامراج دشمن شاعر اور دانشور قرار پائیں گے۔

(1) SAVUSHUN, 1990, Mage Publishers Washington, D.C., page 11